یکم دسمبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۴۵

اس شمارے میں

اداریہ

"بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا"

اردو ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیبی علم اور علامت بھی ہے۔ یہ تہذیب صدیوں کی چمن بندی کا حاصل ہے، اس کی تکمیل میں بازار، خانقاہ اور دربار تینوں نے حصہ لیا ہے اور اس کے سنوارنے اور نکھارنے میں شہری زندگی کے کتنے ہی مشاغل، زندگی اور عاشقی کے کتنے ہی آداب اور مستی اور ہشیاری کے کتنے ہی کرشمے صرف ہوئے ہیں۔ اس میں ہماری دھرتی کی بوباس، ہمارے دشت و صحرا کی فضا، ہمارے کھیتوں اور کھلیانوں کی خوشبو، ہمارے گلی کوچوں کے اسرار، ہمارے کارخانوں کی ہماہمی ہماری مشترک تہذیب کے سبھی نقش و نگار، ہماری تاریخ کی ہر کروٹ، ایک ایسی جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ جلوہ گر ہیں کہ اردو ادب ایک تہذیبی دولت ایک ذہنی سرمایہ اور قدروں کا گہوارہ بن گیا ہے آج کا ہندوستان جاگیرداروں کے دور سے گزر کر سرمایہ داروں کی چکی میں پستا ہوا، سوشلزم کی طرف جا رہا ہے، اسے یہ بھی احساس ہو چلا ہے کہ سوشلزم کے لئے وہ صرف کتابی اصولوں یا دوسرے ملکوں کی لکیر کا فقیر نہیں ہو سکتا، اسے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب اس کی روایات اور مزاج سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ یعنی آج کے سفر میں اس کے لئے زادِ راہ اور ساز و سامان اسے ان تہذیبی اقدار سے ملے گا جو اس کے خون میں رچ بس گئی ہیں، جو اس کا مزاج بن گئی ہیں، جو اس کی روح کا نغمہ اور دل کی دھڑکن کہی جا سکتی ہیں۔ ان تہذیبی اقدار کے بغیر آج کے انسان کی حالت اس نرم و نازک پودے کی سی ہوگی جو گرم ہوا کے ایک جھونکے سے جل جائے یا اس تنکے کی سی جو آندھی اڑا لے جائے۔ حال میں مشہور امریکی دانش ور گال بریتھ نے ایک انٹرویو میں اس بات پر زور دیا ہے کہ امریکہ اور یورپ کو اب پیداوار کی شرح بڑھانے پر زور نہیں دینا چاہئے کیونکہ اس دوڑ میں وہ مشین، اشتہار اور زیادہ سے زیادہ آمدنی کے چکر میں پھنس گیا ہے، بلکہ وقت کے بہتر استعمال روح کی آسودگی اور ذہن کی شادابی کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آج ترقی کے لئے اچھی سے اچھی ملازمت حاصل کرنا، دولت جمع کرنا، ہمسایوں سے بہتر ساز و سامان رکھنا، صبح سے شام تک موٹر گاڑی اور پاؤں پہیہ کرنا، زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہئے، زندگی انسانیت کی کچھ قدروں سے

عبارت ہے۔ تہذیب کے کچھ نقش و نگار سے فطرت کے مطالعے سے، کائنات کے سمجھنے کو سمجھنے سے، فنون لطیفہ اور شعر و ادب اور سائنس اور ٹیکنالوجی دونوں کے مناسب استعمال سے۔ اردو زبان و ادب میں انسان دوستی کا ایک خاصا جامع تصور ہے۔ اس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کی اقدار کا عطر موجود ہے۔ اس میں روایت کا احساس ہے مگر روایت پرستی نہیں ہے۔ یہ مذہبی اور اخلاقی سرچشموں سے بھی سیراب ہے اور سیکولر زندگی کے بوقلموں جلووں سے بھی یہ جز زمین کا عرفان رکھتی ہے مگر آئین نو سے ڈرتی نہیں نہ طرز کہن پر اڑتی ہے۔ اس میں مستی اندیشہ ہائے افلاکی اور زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم، دونوں موجود ہیں، یہ ماورائیت اور ارضیت دونوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اردو جس تہذیب کی علمبردار ہے، اس کی حفاظت، اس کی اشاعت ہمارا اس لئے فرض ہے کہ اول تو اس کے بغیر ہم اپنا پورا قد نہیں پا سکتے، دوسرے یہ ہندوستان کی ایک ایسی دولت ہے جس کے عرفان اور اعتراف کے بغیر ہندوستان بہت کچھ ہوتے ہوئے کچھ کم رہ جاتا ہے، یہ اپنی پوری تاریخ اور پوری تہذیب کا علمبردار نہیں ہو پاتا، تیسرے، اس زبان و ادب میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ یہ ہمارے آئندہ سفر میں بھی ہماری رہنمائی کر سکے اور ہماری ذہنی نشوونما میں مدد دے سکے۔ گویا اردو کے ذریعہ سے مشترک تہذیب کی حفاظت اور اشاعت کر کے ہم اپنی آئندہ نسلوں کی سیرت و شخصیت کی بھی تکمیل کر سکتے ہیں اور ہندوستان کے مستقبل کو بھی ایسا بنا سکتے ہیں کہ اس میں اس کی ساری تاریخ اور صالح ترین روایات جلوہ گر ہوں۔ اس طرح اردو زبان کی بقا اور ترقی کی کوشش صرف حکومت کا کام نہیں رہ جاتا، ہمارے لئے ایک مقدس فریضہ بن جاتی ہے۔ حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ اردو کی ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم کا انتظام کرے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے سہولتیں دے، بجا ہے اور یہ مطالبہ اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک کہ پورا نہ ہو جائے یہ ہمارا جمہوری حق ہے اور ہم اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے، مگر ہمارا اصل کام خود اس کے لئے وقت اور سرمایہ، توانائی اور تدبیر سب کچھ فراہم کرنا ہے۔ ہم کو بہر حال اپنے بچوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دینا ہے جس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ علاقائی زبانوں کو نظر انداز کر دیں۔ ہمارے یہاں یہ یا وہ کا فلسفہ بہت مقبول ہے۔ اب اس کی جگہ یہ بھی اور وہ بھی کا فلسفہ رائج کرنا ہے، یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو میں دینے کے ساتھ ہم علاقائی زبان میں بھی مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر تو ظاہر ہے کہ سب کے اردو پڑھنے کا سوال نہیں ہے۔ آخر ہمیں ڈاکٹروں انجینئروں اور دوسرے پیشہ ور اشخاص کی بھی تو ضرورت ہے لیکن اگر ہمارے طالب علموں کی بنیاد مضبوط ہو گی تو وہ کچھ بھی کریں، اپنی تہذیبی قدروں سے آشنا رہیں گے۔ ہمارا فرض صرف اردو میں تعلیم کا انتظام کرنے پر ختم نہیں ہو جاتا، اس کے لئے ہمیں اردو کے اخبار اور رسالے خریدنے اور اردو کی اچھی کتابوں کی ہر گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنانے پر بھی زور دینا پڑے گا اور اس لائبریری میں صرف طاقت کے ادب کو ہی نہیں آگہی کے ادب کو بھی جگہ دینی پڑے گی۔ اردو دوستوں کو موجودہ بحران سے سراسیمہ ہونے کے بجائے اس کو ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ بنانا چاہئے، اردو زبان و ادب میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زندگی کی ہر منزل پر ہمیں روشنی اور گرمی دے سکے، دیکھنا یہ ہے کہ اردو سے محبت کرنے والے کب اس محبت کی خاطر کچھ بیج بونے، کچھ کاشت کرنے، کچھ نقش بنانے، کچھ در و بام سجانے کے لئے تن من دھن سے لگ جاتے ہیں بقول اقبال ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

مصحف دل شائع ہو گیا

بنگال کے ممتاز شاعر جناب ساجد ابردی (ساجد القادری) کا شعری مجموعہ "مصحف دل" شائع ہو گیا یہ مجموعہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف دو روپے ہے۔ یہ بزم شہود ۱/۸۳ بیل گچھیا روڈ کلکتہ ۳۷ سے مل سکتا ہے۔

■ ایم۔ اے۔ نظر

"ہماری زبان" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر گیان چند

دیوانِ غالب کا متنازع مخطوطہ

ہماری زبان کے حالیہ چند پرچوں میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے غالب کے نو دریافت مخطوطے کے بارے میں کئی مضامین لکھے ہیں جن میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔ اکبر علی خاں نے اس کی تردید میں کچھ لکھا ہے۔ میں خاص طور سے ڈاکٹر انصار اللہ کے یکم اگست، ۱۵ اکتوبر، ۲۲ اکتوبر اور یکم نومبر ۷۰ء کے مضامین کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر انصار اللہ نے اپنے یکم اگست ۷۰ء کے مضمون کے بارے میں مجھ سے رائے طلب کی تھی۔ میں نے نقوش کے غالب نمبر کو سامنے رکھ کر قلم برداشتہ اپنے تاثرات یا مشاہدات ایک نجی خط میں لکھ بھیجے تھے۔ یہ تاثرات ایسے غور و خوض اور گہرے مطالعے کا نتیجہ نہیں تھے کہ ان کی سند پر کوئی استدلال تعمیر کیا جا سکے۔ یوں مجھے ان کو اپنانے سے انکار نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے کہ میں کہیں دور دور تک ایسا ماہر غالبیات نہیں کہ میرے کسی غیر دقیق مشاہدے کو صرف میرے نام کی سند پر تسلیم کر لیا جائے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے جس غیر معمولی دیدہ ریزی سے نئے مخطوطے کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں ان کی اس اخلاقی و ذہنی جسارت کی بھی داد دیتا ہوں کہ مخطوطے کے بارے میں بڑے بڑے علماء اور زعماء کی رائے کے برخلاف انھوں نے مسلمات کی بت شکنی پر کمر باندھی اور ایقان کو تشکیک میں تبدیل کر دیا۔ لیکن ان کے تمام فرمودات سے اتفاق لازمی نہیں۔ مجھے ان سے یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے مضمون میں مثالوں کے متعدد مصرعوں کا صفحہ نمبر نہیں دیا۔ جو مصرعے مصراع ثانی ہیں انھیں تو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے جو مصرع اولیٰ ہیں ان میں سے بعض تو یادداشت کی مدد سے دیوان میں مل گئے بعض کا نشان نہ مل سکا۔ موصوف کے مضمون کی ۲۲ اکتوبر والی قسط کے آخر میں لکھا ہے "باقی ص ۱۱ پر" لیکن ص ۱۱ پر اس کا نام و نشان نہیں اور یہ محذوف جزو اگلے شمارے میں بھی نہیں جگہ پا سکا چنانچہ یکم نومبر کی قسط سے پہلے کچھ سطور چھٹ جانے کا احساس ہوتا ہے۔

۱۵ اکتوبر کے ہماری زبان میں اکبر علی خاں نے ص ۸ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی مجھے اطلاع دی تھی کہ "نسخۂ عرشی اور ضمیمہ نسخۂ عرشی میں فلاں فلاں مندرجات غالب سے غلط منسوب ہوئے ہیں۔ آپ انھیں شرح میں شامل نہ فرمائیں"۔ مجھے یقین ہے کہ اکبر علی خاں صاحب نے یہ اطلاع مجھے ضرور بھیجی ہوگی لیکن سوءِ اتفاق سے مجھے کبھی نہیں ملی۔ ڈاک میں تلف ہو گئی ہوگی۔

مجھے غالب کے انداز خط کی کوئی شناخت نہیں ماہرین غالبیات نے شہادت دی کہ نیا مخطوطہ غالب کے معروف خط میں ہے میں نے مان لیا کیونکہ مخطوطے میں اصلاحوں کی نوعیت اور ترتیب کا انداز یہی گواہی دیتا تھا لیکن بھوپال سے برآمد ہوئے دونوں نسخوں کی کتابت کا بعد میں جو تجزیہ کیا گیا اسے دیکھ کر غالب کی تحریر کے بارے میں ماہرین غالبیات کے قول فیصل پر میرا عقیدہ متزلزل ہو گیا ہے۔

اب میں ڈاکٹر انصار اللہ کے سہ قسطی مضمون ۱۵ اکتوبر تا یکم نومبر ۷۰ء کے بارے میں کچھ عرض کیا چاہتا ہوں۔

اس نسخے کے کاتب کے بارے میں فاضل مضمون نگار کی کیا رائے ہے مضمون کی ہر قسط میں اس سے متعلق مختلف تاثر ملا۔ ۱۵ اکتوبر کے مضمون میں ص ۵ اور ۶ پر زیر تشدد ہوتے جعل سازی کا ذکر ہے۔ میں اس سے یہ سمجھا کہ خدانخواستہ ڈاکٹر نقر کی نظر میں شفیق الحسن بھوپالی، توفیق احمد امروہوی، اکبر علی خاں اور نثار احمد فاروقی ان چاروں نے مل کر کوئی جعل کیا ہے۔ مضمون کی بعد کی قسطوں سے اکبر علی خاں اور نثار احمد فاروقی تو اس بہتان کے دائرے سے نکل گئے لیکن شفیق الحسن اور توفیق احمد دونوں کے بارے میں یہ شبہ رہ گیا کہ نسخے کے خروج کے وقت یہ جانتے تھے کہ وہ دنیا کے سامنے ایک سوانگ کا سد مش کر رہے ہیں۔ عرض ہے کہ جعل کی شناخت تو ڈاکٹر انصار اللہ جیسے اہل علم دنظری کر سکتے ہیں شفیق و توفیق جیسے کم سواد نہیں شفیق الحسن نے اپنی ڈائری میں مخطوطے کو ۱۸۱۶ء کا مکتوبہ کیونکر لکھا اس کی تاویل سے فی الوقت میں معذور ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مخطوطہ فروخت کرتے وقت شفیق الحسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نسخہ ۱۸۱۶ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ بات بعد میں معلوم ہوئی ہوگی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ شفیق نے توفیق کو نسخہ دیتے وقت کہا تھا۔

"میاں کیا یاد کرو گے تمھیں مرزا غالب کے ہاتھ،
کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں"۔

میں اس بیان کو قطعاً باور نہیں کر سکتا۔ بھوپال میں میں نے جو کچھ سنا وہ یہی تھا کہ شفیق نے توفیق کو جب نسخہ دیا تو اول الذکر اس کی اہمیت کا کوئی عرفان نہ رکھتا تھا۔

یہ مخطوطہ اب کہاں ہے مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ کیا اس کا حشر بھی پہلے کے نسخۂ بھوپال کا سا ہو گیا؟

انصار صاحب کی ۱۵ اکتوبر کی قسط میں جعل کا کوئی ذکر نہیں۔ لکھتے ہیں۔

"نو دریافت نسخے کا مدون یا کاتب کوئی ایسا شخص ہے جو غالب کے کلام کی فراہمی کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے وسائل اتنے نہیں کہ براہ راست

مرزا سے یا ان کے باخبر تلامذہ سے استفادہ کرسکتا چنانچہ باوجود کوشش کے اسے بہت کم کلام فراہم ہو سکا۔" (ص ۷)

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ غالب کے ابتدائی دور کی طرف ہے جب کہ غالب کا کلام آسانی فراہم نہ ہوسکتا تھا لیکن مضمون کی تیسری قسط بابت نومبر میں وہ پھر اس نظریے پر واپس آتے ہیں اور اس حرکت کا زمانہ غالب کی وفات سے اتنے بعد کا قرار دیتے ہیں کہ غالب کے باخبر احباب و تلامذہ بہ حالت ہوش و حواس بقید حیات نہ رہے ہوں گے۔ گویا یہ انیسویں صدی کے آخر سے پہلے کی بات نہیں۔ اس زمانے میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ مدون غالب کے کلام کی فراہمی کی کوشش کرے اور باوجود کوشش کے اسے بہت کم کلام فراہم ہوسکے۔ اس وقت تک غالب کے دیوان کے کئی ایڈیشن نکل چکے تھے۔

اب لیجیے میرامانی اسد کی غزل کی بحث۔ میرامانی اسد تلمیذ سودا غالب سے پہلے دور کا شاعر ہے۔ اس کا ذکر متعدد تذکروں میں ملتا ہے لیکن "رم چند رہا" والی غزل صرف گلشن ہمیشہ بہار میں اس سے منسوب کی گئی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۵۳ء کی تصنیف ہے۔ ہمیشہ بہار میں اس غزل کا میرامانی اسد سے منسوب ہونا مخطوطے کے بخط غالب ہونے کا مانع نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر دوسرے قرینوں سے یہ ثابت ہو کہ مخلوط بخط غالب ہے تو یہ طے پائے گا کہ یہ غزل بھی غالب کی ہے اور تذکرہ ہمیشہ بہار میں سہواً میرامانی اسد سے منسوب ہوگئی ہے۔ خود غالب کے قول کے مطابق انھیں کے عہد میں میرامانی کی غزل کو غالب کی سمجھ لیا گیا۔ اسی کی مماثلت پر یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کی کسی ابتدائی قلم زد غزل کو میرامانی سے منسوب کردیا جائے۔

قاضی سراج دھولپوری کی مملوکہ باغ مہر کی تاریخ ترتیب و کتابت ۱۸۶۱ء ہے۔ اس میں مندرجہ بالا غزل خمسے کی صورت میں ہے اور اس کا عنوان "خمسہ میاں جی ہدایت علی در غزل اسد" ہے۔ مارچ ۱۹۸۰ء کے ہماری زبان میں ڈاکٹر نظر نے لکھا ہے۔

"باغ مہر میں ایک اور غزل پر بھی خمسہ لکھا ہوا ہے جس کا مقطع یہ ہے

"آپ میرا وہ احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں کیونکر"

اس خمسہ پر عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے۔ "مخمس معروف برغزل نواب اسداللہ خان بہادر المتخلص بہ اسد ملقب بہ غالب" باوجود دونوں غزلوں کے مقطع میں اسد تخلص ہونے کے مولف نے شاعر کا نام لکھنے میں فرق کیا ہے صاف ظاہر ہے کہ وہ دونوں کو الگ شاعر گردانتا ہے۔" (ص ۸)

مغنی تبسم

سلیمان اریب کی رفیقۂ حیات اور ان کے دوستوں کے لیے ایک نظم

ہم کس کو ڈھونڈتے ہیں
کیسے
اپنے آپ کو ؟
کیا ہم وہاں نہ تھے
یا ہم یہاں نہیں ہیں
یہاں
رات کے تلے
دن کے غبار میں ؟
کیا وہ بھی ہم نہ تھا
کیا ہم بھی وہ نہ تھے
وہ کون تھا
حیات کے لشکر میں
اپنے ساتھ
یہاں
جس کو رو رہے ہیں ؟
ہم کس کو رو رہے ہیں
ہم کس کو قطرہ قطرہ ہو
یاد آرہے ہیں
کیسے
نیند سو رہے ہیں
کیسے
جاگتے رہے ہیں
کیسے
چل رہے ہیں
دور سے
قریب سے
قدم قدم ؟
اٹھائے اپنا بوجھ ہم کہاں گئے
یہاں نہیں ہیں
دیکھنا
درد کے نواح میں
افق کی سمت
لاش جا رہی ہے
کون لاش جارہی ہے جس شام کی طرف ؟

یکم اگست ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں قاضی معراج دھولپوری کے مضمون کو بغور پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ باغ جہر میں مندرجہ بالا غزل کے چھ شعر درج ہیں خمسہ درج نہیں۔ خمسہ چمن بے نظیر سے لیا گیا ہے جس میں سات بند ہیں اور جس پر غالب کا مندرجہ بالا لقب دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی غلط فہمی اکبر علی خاں کو ہوئی ہے۔ اپنے مضمون ضمیمۂ نسخۂ عرشی میں باغ جہر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"غالب کی غزل 'اپنا احوال دلِ زار کہوں یا نہ کہوں'
جسے ان کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف نے تخمیس کیا
تھا خمسے ہی کی شکل میں اس مجموعۂ انتخاب میں شامل
ہے۔"

چمن بے نظیر نایاب کتاب نہیں۔ راجہ رام کمار بکڈپو سے اب بھی گلستانِ سخن کے نام سے مل جاتی ہے۔ یہ نام امیر حسن نورانی صاحب کا دیا ہوا ہے۔ چمن بے نظیر طبع دہم ۱۹۲۷ء کے اجزا کی نئی جلد بندی کر دی ہے اور اسے طبع سوم نام دیا ہے۔ اس کے ص ۳۰۶ پر 'کہوں یا نہ کہوں' والی غزل کا خمسہ مع اپنے شاندار عنوان کے موجود ہے۔

یکم اکتوبر ۷۰ء کے ہماری زبان میں نظر صاحب نے لکھا ہے کہ

"اس غزل پر اس زمانے میں خمسہ لکھا جا چکا
تھا جب مرزا کی عمر تین سال سے زیادہ نہ تھی۔"

یکم نومبر کے ہماری زبان میں انصار اللہ صاحب نے کئی تذکروں سے ہدایت کے عہد کا ذکر کیا ہے۔ بقول شیفتہ اس کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ گلزار ابراہیم و گلشن ہند کے علاوہ مضمون نگار نے تذکروں سے جس ہدایت کا ذکر کیا وہ دوسرا شاعر ہدایت اللہ خاں ہدایت ہے صرف گلزار ابراہیم و گلشن ہند میں اس معروف ہدایت اللہ کے علاوہ کسی ہدایت علی کا بھی ذکر ہے جسے شیخ رحمت اللہ رحمت المتوفی ۱۱۹۱ھ کا معاصر بتایا گیا ہے۔ گلزار ابراہیم غالب سے پہلے کا تذکرہ ہے اور اس میں ہدایت علی کو مرحوم ظاہر کیا گیا ہے گویا ہدایت علی یقیناً غالب کی ولادت سے پہلے کا شاعر ہے لیکن کسی قدر یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ ممکن ہے تخمیس کرنے والا کوئی دوسرا شاعر میاں جی ہدایت علی ہو۔ اگر غالب سے قبل کے کسی نسخے میں یہ غزل یا اس کا خمسہ مل جائے تو غالب کو قطعی طور پر اس غزل سے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ڈاکٹر نظر نے ۲۲ اکتوبر ۷۰ء کے ہماری زبان میں نو دریافت مخطوطے کے متعدد مصرعوں میں لغزش کتابت کی جو مثالیں دی ہیں ان سے میں اپنی رائے میں تذبذب اور تزلزل پاتا ہوں۔ کوئی موزوں طبع شاعر، بالخصوص غالب، ذہنی غیر حاضری کے عالم میں بھی موزوں مصرعوں کو اس طرح غیر موزوں بنا کر نہیں لکھ سکتا۔ 'دعا سے' کو 'دعا نسے' نہیں لکھ سکتا۔ نظر صاحب کی نشان دادہ اغلاط کتابت میں سے بعض کے بارے میں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ع کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا

اس میں لکھتے وقت کاتب کا قلم بہک گیا ہے۔ حلق اور پیٹ کی آنکھ کھلی ہوئی نہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ ممکن ہے کاتب نے حائے حطی کو لکھتے وقت کسی قدر مسخ کر دیا ہو۔ دو بہرے ال ساحل کے صحیح املا سے واقفیت کا ملاحظہ ہو۔

ع غبار کوچہ ہائے موج ہے خاشاک ساحل کا
نقوش ص ۵۶

ع قطرہ سے میخانۂ دریائے بے ساحل نہ پوچھ
نقوش ص ۱۹۲

ع غرقِ بحر جویائے خس و خاشاک ساحل ہے
نقوش ص ۲۰۲

۲۔ جہاں تک اضافت کو یائے مجہول لکھنے کا تعلق ہے میری رائے میں کوئی بھی مثال شبہ سے خالی نہیں۔

الف۔ ع حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
نقوش ص ۱۲۲

یہاں صاف صاف حسن لکھا ہے حسنے نہیں

ب۔ ع ہے مستِ امتحانِ ہوس طینتی اسد
اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

مصرع کی صحیح قرأت یہ ہے

ع ہے مستِ امتحان، ہوس طینتی، اسد!

ج۔ ع بیابانِ دیدۂ آہو کفِ سیلاب ہو جائے
نقوش ص ۲۵۰

ع اے ہوس عرضِ بساطِ نازِ مشتاقاں نہ پوچھ
نقوش ص ۲۶۷

مجھے افسوس ہے کہ میں نے انصار اللہ صاحب کو خط میں لکھ دیا کہ غالب ہمیشہ 'مِن' کو گول پیٹ کے ساتھ لکھتے تھے۔ مزید جائزے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ بیشتر 'مِن' کو گول لکھتے تھے لیکن شاذونادر نصف دائرے کی شکل میں بھی چھوڑ دیتے تھے جس سے نظر صاحب کو یائے مجہول کا مغالطہ ہوا۔

لہ یہ دوسری بات ہے کہ قاضی صاحب نے چمن بے نظیر سے نقل کرنے میں ایک بند اس طرح حذف کر دیا کہ تیسرے بند کے پانچ مصرعے لکھ کر چوتھے بند کا چھٹا مصرع اس میں چسپاں کر دیا۔ نیز یہ غزل غیر مطبوعہ نہ تھی۔ قاضی صاحب کے انکشاف سے پہلے نسخۂ عرشی طبع اوّل میں ص ۲۹۸ پر موجود تھی۔

ٹہ نقوش بابت نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۹۷

ایسی کچھ مثالیں میں پیش کرتا ہوں جن میں حں کا دائرہ محض نصف ہے۔ نقوش کے غالب نمبر سے صفحہ کا نمبر درج کرتا ہوں۔

ع بغیر از بے دلی نومیدی جاوید آساں تر
ص ۵۲

ع بسکہ شرم عارض رنگیں سے حیرت جلوہ ہے
ص ۱۰۰

ع لذت ہے عرض کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ
ص ۱۹۲

ع نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے
ص ۲۲۲

ع گر جو اسدؔ تپش نبض آرزو جلنے
ص ۲۲۶

ع عرض حیرانیِ بیمارِ محبت معلوم
ص ۲۴۰

ع ہے عرض جوہر خط و خال ہزار عکس
ص ۲۵۰

ع بہ نقصِ ظاہری رنگِ کمال طبع پنہاں ہے
ص ۲۶۷

ان تمام مثالوں میں حں یا حٔں نصف دائرے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نے ان سب موقعوں پر اضافت کو یائے مجہول بنا دیا ہے؟ نہیں خط شکست میں دائرے کو محض نصف بنانے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مجھے نو دریافت مخطوطے میں ایک مثال ایسی مل گئی جہاں بغیر اضافت کے حں کا دائرہ نصف بنا دیا گیا ہے۔

ع خطر تو خیز، نیل چشم زخم صافی عارض
نقوش ۱۲۰

پر تھوی چندر کے مرتبہ مرقع غالب میں غالب کے متعدد خطوط کا عکس شائع ہوا ہے۔ ان میں ہر جگہ حں حں پورے دائرے کی شکل میں ہیں لیکن ایک جگہ حں کے نصف دائرے کی مثال بھی مل گئی۔ مرقع میں متن کے بعد رقعات کے عکس کے صفحات پر نمبر نہیں ڈالے گئے لیکن اگر ڈال دئے جائیں تو مطلوبہ رقعہ کا نمبر ص ۲۶۸ ہوگا۔ اس میں لکھتے ہیں۔

کہ سایل مقدار سوال عرض کرے

(بنام کلب علی خاں مورخہ ۲۳ جمادی الاول ۱۲۸۳ھ)

ان دو مثالوں سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ حں یا حٔں کی نصف دائرے والی شکل یائے مجہول نہیں۔

▲

صفحہ ۸ سے آگے

یہ مخمس والے ہدایت نہیں۔ نظر صاحب فیصلے بڑی عجلت میں فرماتے ہیں اور اپنے سینے میں تھام کر رکھنے کے قائل نہیں ورنہ وہ یہ فاحش غلطیاں نہ فرماتے۔ باقی آئندہ عرض کروں گا۔

رامپور۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ

مراسلات

ہندوستان ہمارا

مئی ۱۹۷۰ء کے "آجکل" دہلی میں جناب جگن ناتھ آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے کچھ تاثرات اور یادیں قلمبند کی ہیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جب وہ مڈل کلاس کے طالب علم تھے تو ایک دن ابوالاثر حفیظ جالندھری ان کے والد جناب تلوک چند محروم سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے اپنی ایک کتاب "ہندوستان ہمارا" جگن ناتھ آزاد کو پڑھنے کے لئے دی۔ اس کتاب نے آزاد کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے مڈل کے امتحان میں تاریخ کے پرچہ میں پوچھے گئے سوالات کا جواب بجائے نثر کے نظم میں لکھا۔ جب مڈل کا نتیجہ شائع ہوا تو اس میں ایک نوٹ یہ بھی درج تھا کہ ایک طالب علم نے تاریخ کا پورا پرچہ نظم میں حل کیا ہے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ اب اس کتاب کا کہیں پتہ نہیں ورنہ یہ بہت مفید ثابت ہوتی۔ میں ایک دن اپنی لائبریری میں کچھ کتابوں کو دیکھ رہا تھا کہ نظر یکایک ایک کتاب پر پڑی جس کا نام تھا "ہندوستان ہمارا" اور مصنف کی جگہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کتاب کو میں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور بہت دلچسپ پایا۔ درحقیقت یہ ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے اور جگن ناتھ آزاد نے جو کچھ بھی اس کی تعریف میں لکھا ہے اس کی یہ مستحق ہے۔

سرورق پر ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں امتیاز علی تاج کے مشہور مطبع دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ۲۰۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ یہ پہلا اڈیشن ہے دیباچہ میں علامہ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں "کتاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ تاریخ ہند کے واقعات کو سادہ اردو نظم میں اس طرح لکھا جائے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ جناب حفیظ نے زمانہ قبل تاریخ یعنی راماین اور مہابھارت کی کتھا سے کتاب کو شروع کیا ہے اور ان دونوں مذہبی کہانیوں کو ہمدردانہ نقطۂ نظر اور موثر انداز میں نظم کیا ہے اسی طرح ایک نظم مشہور عالم رہنما گوتم بدھ کے متعلق ہے۔ اس کے بعد سکندر اعظم اور اس کے بعد کی شخصیتیں نظروں کے سامنے آتی ہیں اور پھر چند روایتی مرثیوں اور تاریخ کے عہد وسطیٰ کے بیان کے بعد مسلمانوں کا زمانہ شروع کر دیا ہے۔ جو محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی پر ختم سمجھنا چاہئے۔ سکھوں کی داستان بھی موثر انداز میں آغاز گرو نانک سے لے کر اخیر تک نظم کی گئی ہے اور رنجیت سنگھ کی موت تک ختم ہوئی ہے۔

انگریزوں کے عہد حکومت کا حال دینے کے بعد ترقی اور امیدوں کی دعا پر یہ داستان ختم ہوتی ہے۔ زبان سادہ اور موثر ہے۔ واقعات بے تکلفی، روانی اور قادر الکلامی کے ساتھ مناسب بحروں میں نظم کئے گئے ہیں۔ اور تاریخ کے خشک واقعات کو شاعر کے رنگین تخیل نے دلاویز بنا دیا ہے۔" چودہ بلاک کی رنگین تصویروں نے کتاب کو اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے کتاب کی ابتدا ایک نظم "ہندوستان" سے ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر ایک جانتا ہے ہر ایک مانتا ہے
ہر ایک کا یقیں ہے
اس آسماں کے نیچے ایسی زمیں نہیں ہے
ہر ملک میں ہے خوبی لیکن کہیں کہیں ہے
ہندوستاں کے اندر
جو چیز ہے حسیں ہے

راماین کی داستان بھرت ملاپ پر ختم ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لنکا کو فتح کر کے جس وقت رام لوٹے
بن باس کے بھی سارے دن ہو چکے تھے پورے
بھیجی بھرت کو چٹھی ہم آرہے ہیں بھائی
خوش خبری یہ بھرت کو قاصد نے جا سنائی
بس ہوگیا خوشی سے گلنار منہ بھرت کا
جلدی سے شہر بھر میں پٹوا دیا ڈھنڈھورا
آنکھوں میں نور آیا۔ دل میں خوشی سمائی
نکلا اجودھیا سے کرنے کو پیشوائی

"مہابھارت کی کتھا" اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

وہ مہابھارت کی ہم تم کو سنائیں داستاں
ہستنا پور میں تھا حاکم چندربنسی خاندان

"مہاتما بدھ" نظم قابل ذکر ہے۔ گوتم اور مصاحب کے سوال و جواب ملاحظہ ہوں۔

بہت حیران ہو کر پوچھا گوتم نے کہ "یہ کیا ہے"
مصاحب نے کہا "کچھ بھی نہیں ہے ایک مردہ ہے
ہماری ہی طرح کا آدمی ہے۔ مر گیا ہے یہ
ہماری دکھ بھری دنیا کو خالی کر گیا ہے یہ
اسے شمشان میں لے جائیں گے جا کر جلا دیں گے
اسے روئیں گے کچھ دن اور پھر دل سے بھلا دیں گے

اشوک کے متعلق لکھتے ہیں۔

پانی پت کا تھا راجہ اشوک

سارے راجوں کا مہاراجہ اشوک

بابر اور رانا سانگا کی لڑائی دیکھیں ملاحظہ ہو۔

تھا رانا سانگا ان دنوں چتوڑ کا راجا
کہ تھا سارے بہادر راجپوتوں کا مہاراجا
اٹھا ہمراہ اپنے لے کے وہ اک لاکھ کا لشکر
بڑے دعوے سے حملہ کرنے آیا شاہ بابر پر
سنی جب یہ خبر بابر نے سرداروں کو بلوایا
سنا کر حال سانگا کا ہر اک سے مشورہ چاہا

بابا نانک پر جو نظم لکھی گئی ہے بہت اچھی ہے۔

بابا نانک صلح کل تھے ان کو سمجھانے لگے
راہ سے بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لانے لگے

اکبر کے متعلق لکھتے ہیں!

شجاعت کے سبب بجنے لگا شہرت کا نقارہ
تدبر سے کیا ہندوستاں زیر نگیں سارا
ہوا امن و اماں ہر اک جگہ اس کی حکومت میں
یہ ہے مشہور فیاضی میں نیکی میں عدالت میں

پانی پت کی تیسری لڑائی ملاحظہ ہو۔

آج اس میداں میں پھر محشر بپا ہونے کو تھا
قسمت ہندوستاں کا فیصلہ ہونے کو تھا
مرہٹوں کی فوج تھی۔ دو لاکھ اور اسی ہزار
ساتھ پنڈارے بھی تھے جن کا نہ تھا کوئی شمار

انگریزوں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان پر ایک ایک نظم ہے آخری نظم ہمارا جہ رنجیت سنگھ پر ہے اور اس کے بعد نیک امیدوں اور دعاؤں پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

عیسائی، پارسی، سکھ	ہندو ہو یا مسلماں
نیکی ہے دھرم سب کا	نیکی ہے سب کا ایماں
سب سے کرو بھلائی	مذہب کا ہے یہ فرماں
حاصل نہیں آج تم کو	ہر اک طرح کے ساماں

یہ فائدے اٹھالو
بھارت کے نونہالو
ہندوستان والو

حفیظ کی شاعری کا یہ ابتدائی نمونہ ہے۔ اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شاعر "شاہنامہ اسلام" جیسی مثنوی آگے چل کر لکھنے والا ہے۔ اس کتاب کی دوبارہ اشاعت قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے۔ ہندوستان میں اس کا ایک اڈیشن شائع کیا جا سکتا ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۴۰ ہے۔

بریلی۔ • بشیر علی صدیقی

بسلسلۂ تبصرہ نسخۂ عرشی زادہ

انصار اللہ نظر صاحب نے جو تبصرہ نسخۂ عرشی زادہ پر مرتب فرمایا ہے اس کے سلسلہ میں اپنی گزارشات تفصیل سے بھی عرض کروں گا۔

فی الحال بہت سامنے کی غلطی ہائے مضامین گنا دوں۔

۱۔ شرار فرصتے سرمایۂ جندیں چراغاں ہے

پڑھیے "چمن میں" آپ کا اپنا سہو اور خط شکست سے ناآشنا ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ کہ جز موج کو خمیازۂ ساحل باندھا

نسخۂ عرشی زادہ میں میں نے کئی کئی بار دیکھا غالب نے یونہی لکھا ہے خدا جانے ساحل ہائے ہوش سے انصار اللہ صاحب نے کہاں دیکھ لیا اور غالب کے حساب میں لگا دیا۔

۳۔ یہی حال

ترے سرو رعنا سے یک قد آدم

کا ہے۔ وہ نقطے جنھیں ن پڑھ لیا ہے موصوف نے 'روشنائی کے دھبے ہیں جو اصل میں بھی تھے ان جیسے نقطے تو دیوان میں لاتعداد ہیں۔

۴۔ خونابہ اور خون ناب علیحدہ علیحدہ لغت ہیں

خونابۂ ہلال حسرت چشیدہ ہوں میں خونابہ

ہے اور ایسے تمام مقامات پر غالب نے ہمیشہ خونابہ لکھا ہے خوناب نہیں لکھا۔

۵۔ انصار اللہ صاحب کی مثالیں تلاش کر لینے کے باوجود بھی مجھے اسی پر اصرار ہے کہ غالب نے کبھی ٹ پر ط اور ڈ ڑ پر چار نقطے نہیں بنائے ٹ پر ہمیشہ چار نقطے اور ڈ ڑ پر ط بنائی ہے۔ انصار اللہ صاحب کی مثالوں میں تو ایک نئی صورت ہے یعنی صرف دو نقطے ہیں جو غالب کے علاوہ بھی اردو میں ڈ ڑ پر نہیں بنائے گئے تین صورتیں اردو میں رائج تھیں ط یا ( ) ( ) پیش کردہ مثالوں میں طباعت کے نقص نے ط کو .. یہ شکل دے دی ہے غالب نے ط ہی بنائی تھی۔ انصار اللہ صاحب مطمئن نہ ہوں تو ان کے ماخذ ہی سے مثالیں دوں۔

۶۔ اور آخر میں عرض کروں گا کہ اردو شاعری میں ہدایت تخلص کا ایک ہی شاعر نہیں تھا اور خود دو کال ہدایت گزر رہے ہیں من جملہ ان کے ایک میاں ہدایت علی اکبرآبادی شاگرد نظیر بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کا سراغ نہ ملے نظر صاحب کو نہیں بتا تا دوں گا۔ یہ تو نظر صاحب نے سمجھ ہی لیا ہوگا کہ میاں ہدایت علی غالب کے معاصر اور ہم وطن ہوئے۔ انھیں نے دم چند غم چند کو مخمس کیا ہے۔ ہدایت اللہ ہدایت ایک اور شخص ہوئے ہیں۔

(باقی صفحہ ۲ پر)

اخبار و اذکار

ماریشس میں اردو کے لئے قومی ادارے کا قیام

ماریشس میں جو نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ۱۸ ستمبر کو ہز ایکسیلنسی گورنر جنرل کے ہاتھوں اور آنریبل وزیر اعظم ڈاکٹر رام غلام کی سرپرستی میں ہوا، اس کی خبر ۸ اکتوبر کے ہماری زبان میں شائع ہو چکی ہے اب جو تفصیلات حاصل ہوئی ہیں ان کے پیش نظر یہاں ان تقاریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو اس موقع پر کی گئیں۔ ادارہ

اس قومی اردو انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح جناب گورنر جنرل عبد الرزاق محمد عثمان سی۔ بی۔ آئی کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقع پر وزیر اعظم، غیر ملکی سفراء اور ملک کے عظیم و نامور حضرات بھی موجود تھے۔ سب سے پہلے انسٹی ٹیوٹ کے صدر جناب عبد اللہ کریم جی نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے جناب وزیر اعظم ڈاکٹر سر رام غلام کو اسی روز ان کی سترویں سالگرہ پر دلی مبارکباد پیش کی اور پھر ادارہ کے قیام کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ اس ادارے کا مقصد ماریشس میں اردو کی ترقی اور اشاعت ہوگا۔ اس میں اردو کے کلاس لگیں گے۔ ایک لائبریری کا قیام عمل میں آئے گا اور ایک لیکچر فورم قائم کیا جائے گا جس میں مختلف موضوعات پر بحث و مباحثے ہوا کریں گے اس طرح یہاں کے باشندوں کو ہندوستان کے بڑے بڑے نامور شعراء سے متعارف کرایا جائے گا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آئے ہوئے جناب پروفیسر اطہر پرویز صاحب کی علمی و ادبی خدمات اور ماریشس میں اردو کی ترقی و اشاعت میں ان کی سرگرمیوں کو سراہا ہے اور بتایا کہ ادارہ زیادہ تر انہی کی تجویز اور رہنمائی سے وجود میں آیا ہے۔ آخر میں انہوں نے آنریبل سر عبد الرزاق محمد صاحب کا ادارے کی تعمیر میں ان کی مخلصانہ امداد اور دلچسپی کے لئے شکریہ ادا کیا۔ اور ممبران کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے ادارے کی تعمیر کے لئے فراخ دلی سے چندہ دیا اور دوسروں سے فراہم کیا۔

ان کی تقریر کے بعد صدر جلسہ جناب پی۔ بی دھرم بیر ایم ایل اے نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ آج کے غیر معمولی جلسے کی صدارت کا موقع دے کر آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مجلس کی کرسی صدارت کا حقدار میں نہیں ہوں کیونکہ میں فن کار نہیں، ادیب نہیں۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری عزت افزائی کر کے آپ نے ان دیو قامت فن کاروں کی یاد تازہ کی ہے جنہوں نے کشمیر کی حسین وادی سے نکل کر اردو ادب کے گیسوؤں کو سنوارا ہے میرا مطلب پنڈت رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت دیا ناتھ مست اور اردو ڈرامے کے شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری سے ہے پھر اس سلسلے میں سب سے اہم اور مضبوط کڑی شاعر مشرق علامہ اقبال سے ہے جن کی شاعری کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔

لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا جس طرح اردو ادب کی بنیادی تعمیر میں کشمیری مصنفوں کا ہاتھ ہے اسی طرح آج اس عمارت کو خوبصورت بنانے میں کشمیری مصنفین کسی سے پیچھے نہیں۔ مرحوم سعادت حسن منٹو اردو ادب کے ایسے افسانہ نگار تھے جن کو بلاشبہ دنیا کے افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔

آج بھی زندہ ادیبوں میں کرشن چندر اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دراصل زبانیں تہذیبوں کو زندہ رکھنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ زبانوں کی مدد سے تہذیبیں بنتی اور سنورتی ہیں۔ ہم اگر اپنی قومی تہذیب کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیں تو ہمیں اپنے ادب کے خزانوں کو کھنگالنا ہوگا۔ اردو ادب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بیش قیمت میراث ہے، یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی نشانی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کسی ایک فرقے، گروہ، مذہب یا علاقے کی تہذیب نہیں۔ اس میں ایک رنگ نہیں بلکہ ہزاروں رنگ ہیں اور یہ اتنے گھل مل گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اردو زبان کوئی خالص زبان نہیں یہ خود بہت سی زبانوں کا سنگم ہے۔ اس میں اور زبانوں کے الفاظ برابر آتے رہے ہیں اور اس کے خزانے کو مالا مال کرتے رہے ہیں۔ اگر ایک طرف اس کی لسانی بناوٹ سنسکرت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی گرامر ہندی کی بنیاد پر ہے اور اس کا رشتہ برج اودھی، ہریانی اور بھوجپوری سے ہے تو دوسری طرف اس کا تہذیبی رشتہ عربی اور فارسی سے بھی ہے۔ اگر اس نے ہندوستان کی تمام بولیوں اور زبانوں سے اپنا دامن بھرا ہے تو انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی کے اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔

زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور انہیں کسی خاص خطے سے محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دلی اور لکھنؤ میں پھلنے پھولنے والی یہ زبان کس طرح ہزاروں میل کا

سفر کرکے مورشس آئے۔

آج اردو ادب میں ہر مذہب وملت، عقیدے اور نظریے کے ادیبوں اور شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اس میں شبیر حسن خاں جوش بھی ہیں اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری بھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین بھی۔ اور کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اپندرناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، عصمت، شاہد لطیف، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، دیناناتھ نادم وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔

میں نے یہ محض چند نام گنائے ہیں جو مختلف مذہبوں اور نظریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اردو زبان سب کی زبان ہے اس کا محض کسی ایک گروہ سے تعلق نہیں۔ ابھی پچھلے سال آپ نے دیکھا کہ اس کے عظیم شاعر غالب کی صد سالہ برسی دنیا کے ۲۲ ملکوں میں کس شان سے منائی گئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان اور اس کا ادب عالمگیر حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ مورشس میں ایک بڑی کمی پوری ہو رہی ہے۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کا قیام آج بڑے مبارک دن ہو رہا ہے جب کہ مورشس کے لوگ اپنے وزیر اعظم کی سالگرہ منا رہے ہیں اور اس ادارے کا افتتاح ہمارے گورنر جنرل صاحب کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ INSTITUTE صحیح معنوں میں اس جزیرے میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرے گا اور بلا امتیاز مذہب وملت سب کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ آخر میں آپ نے گورنر جنرل وزیر اعظم اور حاضرین کا ان کی تشریف آوری اور ادارے سے ان کی دلچسپی پر شکریہ ادا کیا۔

ان کے بعد جناب آنریبل وزیر اعظم ڈاکٹر رام غلام نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس ادارے کے قیام کا دن ماریشس کی تاریخ میں ایک اہم دن شمار ہوگا۔ . . . .

اس کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اب اردو بولنے اور پڑھنے والوں کے لئے ایک ایسی جگہ ہوگئی جہاں سے وہ کتابیں حاصل کرسکیں اور جو ان کی تہذیب و ادب کے لئے ایک مفید کام انجام دے سکے اور جہاں پر ہر ملت و مذہب کے لوگ آکر آزادی کے ساتھ اردو سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ میں خود ہر اتوار کی شام کو زبانوں کی اشاعت کے سلسلے میں جاتا رہا ہوں۔

چند سال پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ایک اردو اخبار نکالوں اور ساتھ ہی ساتھ ہندی اور تامل اخبار بھی نکالوں مگر اس میں مجھ کو کامیابی نہ ہوسکی۔ آج کل کے نوجوان ان زبانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے ہیں جو ان کے باپ دادا ہندوستان سے لائے تھے اور اسی طرح وہ اپنی تہذیب کو فراموش کرنے لگے ہیں اگر یہ زبانیں زندہ ہیں تو محض ملاؤں اور پنڈتوں کی کوششوں سے جنھوں نے ان کو پڑھایا۔ یہاں پہلی مرتبہ اس قسم کا ادارہ قائم عمل میں آیا ہے جو اردو کے متعلق کام کرے گا اسی طرح انھوں نے بتایا کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کو سکھایا جاتا ہے انھوں نے امید ظاہر کی کہ سب لوگ مل جل کر کام کریں گے انھوں نے کہا ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کے بانیوں میں ایسے لوگ ہیں جو بہت محنت کرتے ہیں اس لئے یقیناً اس ادارے کو کامیابی حاصل ہوگی۔

پروفیسر اطہر پرویز صاحب نے معزز حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ آج انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے مورشس میں ایک تاریخی کمی پوری ہو رہی ہے۔ مجھے ایک سال پہلے کی بات یاد آرہی ہے جب ترولے میں "یوم اردو" منایا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے صدارتی خطبے میں چند معروضات پیش کئے تھے۔ انھیں میں آج پھر دہرا رہا ہوں کہ جہاں تک حکومت مشرقی زبانوں کو فروغ دینے کا کام کرسکتی ہے وہ کر رہی ہے اب عوامی سرگرمیاں دکھانا عوام کا کام ہے دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنا فرض کس طرح پورا کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک سال کے اندر ہی اندر عوام نے اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کی اور اس ادارے کا قیام اس کا عملی اظہار ہے۔ اس ادارے کے قیام سے آج اس جزیرے کے باشندے اپنے اجداد کی روحوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں وہ بزرگ جو آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہندوستان سے آئے تھے یہاں آکر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کے باوجود انھوں نے اپنی تہذیب کو برقرار رکھا اور اپنی زبانوں کو سینے سے لگائے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سیکڑوں برسوں کے بعد بھی یہ زبانیں زندہ ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ان زبانوں کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب بھی اس جزیرے میں پھلے پھولے گی تقریر جاری رکھتے ہوئے آخر میں آپ نے کہا کہ اس ادارے کا قیام ایک بڑے مقصد کی پہلی منزل ہے۔ اس جزیرے میں پانچ مشرقی زبانیں پل رہی ہیں ہندی، اردو، تامل، تلگو اور مرہٹی اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب مل جل کر کام کریں۔ ضروری ہے کہ ہم ان تمام زبانوں کی انجمنوں کی ایک فیڈریشن قائم کریں۔ آخر میں آپ نے وزیر اعظم گورنر جنرل اور اردو دوستوں کی حوصلہ افزائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور آئندہ بھی اس تعاون کے سلسلے کو جاری رکھنے کی درخواست کی۔ (اطہر پرویز)

(باقی صفحہ ۱۲ سے آگے)

بھی ہے کہ ہم اپنے اعمال کی زندگی سے برابر بہتر اور بہترین اعمال کی زندگی کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ تاآنکہ رحمت اور سعادت کے سائے ہم پر پڑنے لگیں۔ لینگ لینڈ کے ذہنی ارتقا کو ہم کچھ اس طور پر مختصراً بیان کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے سماج میں ہر سطح پر ذہنی اور اخلاقی خلفشار سے دوچار ہوا اور اسے اپنے گہرے اور بھرپور طنز کا نشانہ بنایا۔ انسانی سرشت میں شر جس طور پر پیوست ہے اسے انتہائی موضوعیت اور شقاوت کے ساتھ اپنی نظم کے پہلے حصے میں نمایاں کیا۔ لیکن پھر یکایک اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اصلاح محض قانون یا ادبی طنز کے ذریعے ممکن نہیں سماج کی اصلاح سے پہلے فرد کی نفسی اور باطنی اصلاح ضروری ہے۔ اور اس کا پہلا زینہ احساس گناہ اور اس پر ندامت ہے۔ سات مہلک گناہوں کا توڑ جن کے درمیان انسانی روح گھری ہوئی ہے، چار بنیادی نیکیوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لیکن مجموعی طور پر خیر اور حق کو اپنانے کے لئے وہ زندگی اپنانا ضروری ہے، جس میں الوہیت (DIVINITY) مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا حصول محبت یا کریم النفسی (CHARITY) پر عمل پیرا ہوئے بغیر ممکن نہیں نظم کے سولھویں حصے میں (TREE OF CHARITY) کو جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ دینیات مادرا ہے گو اس کی تہ میں گہری مذہبیت کارفرما ہے یہی حال نظم کے اٹھارویں حصے کا ہے جسے نظم کا قلب کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تمام تر بنیاد حضرت مسیح کی زندگی ان کے معجزات مصائب اور ان کے مصلوب کئے جانے کے واقعے پر ہے۔ لینگ لینڈ کے نزدیک حق کی جستجو کی تکمیل محبت کے بغیر ممکن نہیں اور عام انسانوں کے لئے محبت کا یہ بے پایاں جذبہ حضرت مسیح کی ذات مقدس میں مرتکز ہو گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس نظم کی بنیاد میں GOD-MAN کا وہ تصور ہے جسے مسیح کی شخصیت سے ممیز نہیں کیا جا سکتا، میں اس بات پر پھر زور دینا چاہتا ہوں کہ یہ عظیم ادبی کارنامہ محض فلسفہ یا دینیات نہیں ہے، بلکہ اس کی ڈرامائی حیثیت مسلم ہے۔ یہ دراصل ایک ہمہ گیر رویائے خیر و شر ہے۔ جس کی تہ میں عیسائیت کے مذہبی اقدار موجود ہیں۔ شاعر کا تخیل اس کے گہرے مذہبی جذبے سے آتش گیر ہوتا ہے اور اسی عمل کے دوران اس کی بھرپور شعری صلاحیتیں اپنے بے محابا اظہار و بیان کے لئے ایک راستہ تلاش کر لیتی ہیں۔ لینگ لینڈ دینیات اور فلسفے کے مروجہ اور ہم عصری مسلمات اور میلانات سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے وہ اس زمانے کی پند و وعظ (SERMON) کی روایت سے بھی حسب دلخواہ فائدے اٹھاتا ہے، لیکن وہ سرتاپا شاعر ہے۔ البتہ اس کا شعری ادراک دانتے کے شعری ادراک کی طرح کیتھولک (CATHOLIC) عیسائیت کے سانچے میں وہ کبھی اپنا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصر شاعر چاسر سے اس لئے بڑا ہے کہ موخرالذکر صرف ہم عصری سماج کی نقاشی پر زور دیتا ہے۔ اس کے یہاں بیشک زندگی کا رس ہے۔ طنز و مزاح کے تیکھے وار ہیں اسے پوری کائنات سے جس میں انسانوں کے علاوہ حیوانات اور نباتات بھی شامل ہیں، گہری محبت ہے اور وہ انسانی اعمال کی کوتاہیوں اور کجروزاویوں پر بھی زیر لب مسکراتا ہے لیکن اس کی شاعری کوئی مابعدالطبیعاتی سطح نہیں رکھتی۔ لینگ لینڈ کے یہاں ارض و سماوات کی وسعتیں، پہنائیاں اور بلندیاں ملتی ہیں۔

یہاں یہ اشارہ کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ازمنۂ وسطیٰ کے بارے میں، جسے تاریکی کا دور کہا جاتا ہے عام تصور بہت ہی جاہلانہ اور گمراہ کن ہے اور یہ تاریخی سیاق و سباق سے ناآشنا ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ ورنہ درحقیقت ازمنۂ وسطیٰ کا تمدنی اور تہذیبی سانچہ اپنے اندر علم و معرفت کی جتنی پرتیں (LAYERS) رکھتا ہے، وہ بعد کے ادوار سے کسی طرح کم نہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے ذہنی ترفع، ثروت اور بلوغت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بات کیا کچھ کم ہے کہ اس نے دانتے، لینگ لینڈ اور چاسر جیسے باکمال شاعروں کو جنم دیا۔ یہ تینوں شاعر خصوصاً دانتے اور لینگ لینڈ ازمنۂ وسطیٰ کے ذہنی ورثے کی عظمت پر محکم دلیل ہیں اور اعلیٰ شاعری کے کسی بھی معیار پر وہ دونوں حتی طور پر پورے اترتے ہیں۔ دانتے کے سلسلے میں ٹی، ایس ایلیٹ کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ اگر ہم شاعری کو شاعری کی طرح پڑھیں، تو ہمیں اس کی دینیات یعنی مذہبیت پر ایمان لانے میں تامل نہ ہوگا۔

▲

●

★ مردم شماری کا ابتدائی کام شروع ہو گیا ہے مکانوں پر نمبر لگ گئے ہیں۔ آپ یہ دیکھ لیجئے کہ آپ کے مکان پر نمبر لگایا گیا ہے یا نہیں اگر نہیں لگا ہے تو اپنی انجمن کی شاخ کے نمائندوں کے ذریعہ سے ضلع کے حکام کو مطلع کیجئے مردم شماری کے کارکن صرف ان مکانوں پر اندراجات کے لئے آئیں گے جن پر نمبر لگا ہے۔

(پروفیسر) اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

گذشتہ صحبت میں مغرب کے جن پانچ بڑے شاعروں کا سرسری طور سے ذکر کیا گیا تھا ان میں سے دو کے بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو فی الوقت مقصود ہے۔ اور یہ دو شاعر ہیں دانتے اور لینگ لینڈ۔ شروع ہی میں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شعری ادب میں ان سے بلندتر قد و قامت کے شاعروں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دانتے کی چار تصانیف زمانی ترتیب کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، یعنی VITA NUOVA ،CONVIVIO ،MONARCHIA اور DIVINA COMMEDIA جو تین حصوں پر مشتمل ہے INFERNO، PURGATORIO اور PARADISO۔ دانتے کئی حیثیتوں سے قابلِ مطالعہ ہے۔ وہ ایک غنائی شاعر ہے، اس کے سیاسی تصورات، خاص طور پر اس کا (IMPERIAL AUTHORITY) کا نظریہ، اہم ہیں۔ زبان کے مسئلے پر بھی اس کا نقطۂ نظر توجہ طلب ہے۔ اطالوی زبان کی VERNACULAR کو جس کے ڈانڈے لاطینی سے ملتے ہیں، وہ جس طرح اپنے تصرف میں لایا ہے، اس کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اس کی شاعری کی ایک غیر مذہبی SECULAR سطح بھی ہے اس کے یہاں اس تضاد کا عکس بھی ملتا ہے، جو عقلیت اور عقیدہ کی کشمکش نے اس دور میں پیدا کی تھی۔ اس کے یہاں بیک وقت سینٹ ٹامس کا علم الکلام بھی ملتا ہے، اور سینٹ آگسٹن کے ایمان کی تجلیاں بھی اس کے یہاں بکھری نظر آتی ہیں۔ جن تین مسائل سے وہ زبردست دلگیر یہاں نظر آتا ہے، وہ ہیں عدم سے تخلیق کا وجود میں آنا، مادے اور روح کا تعلق اور آزاد قوتِ ارادی کی نوعیت اور اس کا دائرۂ کار۔ لیکن یا این ہمہ دانتے کے یہاں کیتھولک عیسائیت سے انحراف یا اس کی تعلیمات کے بارے میں شبہ کہیں سے راہ نہیں پاتا۔ بلکہ اس نے اپنی ذہنی الجھنوں کا حل اسی میں تلاش کیا ہے۔ جن دو موضوعات کے پایاں کا رنگ اس کے ذہن پر غلبہ نظر آتا ہے، وہ ہیں انسان کا کسی اونچی طاقت سے گہرا ارتباط اور دوسرے گناہ کا احساس اور خدا سے عفو کی توقع۔ دانتے کا عیسائیت کا تصور یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک لافانی رویائے (VISION) کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔ درمیانی عہد کی دونوں تصانیف یعنی CONVIVIO اور MONARCHIA میں فعال (ACTIVE) زندگی کا مدار خود مکتفی عقل کو بروئے کار لانے پر ہے اور مستغرق (CONTEMPLATIVE) زندگی کا مدار وجدانِ محض (PURE INTELLECT) کو بروئے کار لانے پر جو اپنی اصل کے اعتبار سے الوہی ہے۔ ان دونوں کارناموں اور COMMEDIA کے درمیان فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کا سروکار تمام تر حیاتِ فانی سے اور موخر الذکر کا حیاتِ دوام سے ہے۔ سب سے پہلی تصنیف یعنی VITA NUOVA میں ہمیں ایک طرح کا نفسیاتی ارتفاع SUBLIMATION ملتا ہے۔ اپنی محبوبہ (BEATRICE) کی شخصیت سے شاعر نے جو فیضان، آسودگی اور اہتزاز حاصل کیا تھا وہ ایک ناقابلِ بیان عمل کے ذریعہ بالآخر دیدارِ خداوندی میں متشکل ہو کر اس کے خیالات اور احساسات کی تطہیر اور تقلیب ماہیت کا ذریعہ بنتا ہے۔ BEATRICE کی آنکھیں اور اس کی مسکراہٹ جویائے مرحمت کے لئے ایک بالاسطہ زینے کا کام دیتی ہیں۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ COMMEDIA کی COSMOLOGY کے بارے میں اب تک یہ خیال عام تھا کہ وہ تمام تر عیسائیت کی دین ہے، مگر تازہ ترین تحقیقات سے اس قیاس کو تقویت ملی ہے کہ دانتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج مبارک کے واقعے سے متاثر ہوا تھا اور اس کی نظم میں مختلف طبقات سماوی کے سفر پر اس کا نقش گہرا اور واضح ہے دانتے نے بلاشبہ ارسطو کی اخلاقیات، البرٹ اعظم اور سینٹ ٹامس سے بھی اثر لیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی عیسائیت، سینٹ آگسٹن اور مسلمان مفکروں میں ابن رشد سے جو اثرات اس نے قبول کئے وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

لینگ لینڈ کی واحد عظیم مجازیہ تخلیق (VISIONS OF PIERS PLOWMAN) انگریزی شاعری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ازمنۂ وسطیٰ کے کلیسائی نظام اور معاشرتی اور معاشی اداروں پر محض ایک بھرپور طنز سمجھنا صریح غلطی ہے۔ یہ نظم محض دینیات بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک رویائے VISION ہے خیر، محبت اور معرفت کا۔ دانتے اور لینگ لینڈ کے یہاں بہت سے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ کیا نجات ان لوگوں کا مقدر نہیں ہے جو غیر مبطِّرہ (UNBAPTIZED) ہیں؟ بہ الفاظِ دیگر نجات کا انحصار عقیدہ اور ایمان پر ہے یا فہم و دانش پر۔ لینگ لینڈ کے یہاں بھی تین زندگیوں کا تصور ملتا ہے، یعنی فعال زندگی، مراقبے کی زندگی اور فہمائش اور مذہبی اقتدار کے نفاذ کی زندگی۔ اسی سے منسلک اور مربوط یہ خیال

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD-NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R-NO. 2186/57